فکر اقبال کی سیاسی اور تہذیبی اہمیت

فضہ پروین

فکر اقبال کے دو اہم مدار قارئین کے لیے قابل توجہ ہیں۔ان میں سے ایک مدار تو وہ ہے جس میں وہ اپنی بصیرت کے اعجاز سے معاشرتی اور سماجی زندگی کو قومی اور ملی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی سعی میں مصروف نظر آتے ہیں فکر اقبال کا دوسرا مدار اس سے زیادہ وسعت کا حامل ہے۔اس میں وہ اپنی پوری قوت، جذبے اور ارتکاز توجہ کے ساتھ اپنی خداداد صلاحیتوں کو رو بہ عمل لا کر دلوں کو مرکز مہر و وفا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔یہ مدار اپنی نوعیت کے لحاظ سے آفاقی نوعیت کا حامل ہے۔بادی النظر میں یہ دونوں مدار اپنے الگ الگ مقاصد اور اہداف کی جانب سرگرم سفر رہتے ہیں مگر ان میں ربط باہمی بھی موجود ہے۔علامہ اقبال نے عصری آگہی کو پروان چڑھانے کے سلسلے میں جو فقید المثال جد و جہد کی اس کا تاریخی تناظر میں مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اپنی علمی بصیرت سے انھوں نے مستقبل کے بارے میں جو پیش بینی کی تھی وہ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ زندگی کے تمام مسائل پر ان کی گہری نظر تھی۔ معاشرتی ،سماجی ،تہذیبی اور سیاسی زندگی کے حسن و قبح پر ان کے مدبرانہ تجزیے متعدد نئی بصیرتوں کے مظہر ہیں۔ان کے افکار میں تدبر، تفکر اور تعقل کا جو دھنک رنگ منظر نامہ دکھائی دیتا ہے اس کے اعجاز سے قاری ایک جہان تازہ کی جھلک دیکھ لیتا ہے جو ملت اسلامیہ کے روشن مستقبل کی نوید لیے ہوئے ہے۔حرف صداقت لکھنے کا یہ منفرد انداز فکر اقبال کا منفرد روپ سامنے لاتا ہے۔

علامہ اقبال نے مغرب کے تصور قومیت کو بانگ دہل ہدف تنقید بنایا۔مغربی تصور قومیت اس قدر لغو، غیر حقیقی اور غیر فطری ہے کہ اس کے مسموم اثرات سے رتیں بے ثمر ہو کر رہ گئی ہیں۔مغربی تصور قومیت میں انسانیت کے وقار اور سر بلندی کا سرے سے کوئی معیار ہی دکھائی نہیں دیتا۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یورپی اقوام نے اسلامی تعلیمات سے متصادم ایک ایسا تصور قومیت اپنایا جس میں بنیادی انسانی حقوق کو ئی خیال نہیں رکھا گیا۔اسلامی قومیت کا تصور ان کے خیال میں جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے اور اس کے اعجاز سے ملت اسلامیہ کے اتحاد کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔علامہ اقبال نے مغربی تصور قومیت اور اسلامی تصور

قومیت کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے اصلاحی اور تعمیری انداز میں یہ مشورہ دیا تھا:

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اسلامی قومیت سے علامہ اقبال ملت اسلامیہ کی مجموعی قوت مراد لیتے ہیں۔انھوں نے بالعموم قوم کے بجائے ملت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ملت کا یہ آفاقی تصور مذہب کی اساس پر استوار ہے جس میں نہ صرف ہر قسم کے امتیازات کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی راہ دکھائی گئی ہے۔علامہ اقبال نے علاقائی ،نسلی ،لسانی اور رنگ کی بنیاد پر کی جانے والی حد بندیوں اور امتیازات کے خلاف ہمیشہ کھل کر لکھا۔ان کا خیال تھا کہ جو بھی اس نوعیت کے امتیازات کا حامی ہوگا وہ نیست و نابود ہو جائے گا۔ملت اسلامیہ کی ترقی ،خوش حالی اور بقا نوشتہء تقدیر ہے۔ملت اسلامیہ نے روشنی کے جس سفر کا آغاز کیا ہے ،اس کی راہ میں حائل ہونے والی قوتوں کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے گا۔ملت اسلامیہ کے بارے میں علامہ اقبال کے تصورات نے نہ صرف برعظیم کے مسلمانوں کو ایک ولولہء تازہ عطا کیا اس کے اثرات پوری دنیا پر بالعموم اور اسلامی ممالک پر بالخصوص مرتب ہوئے۔علامہ اقبال کا خیال تھا کہ مذہب ،تہذیب و تمدن ،تاریخ اور مستقبل کے لیے ایک ٹھوس اور واضح منصوبہ بندی کو جہد للبقا کے سلسلے میں کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ملت اسلامیہ کو تصور قومیت کی حقیقی روح سے آشنا کرنے کے سلسلے میں علامہ اقبال کی خدمات بہت اہم ہیں۔انھوں نے مذہب کو اسلامی قومیت کا اہم ترین جزو قرار دیا:

قوم، مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں، محفل انجم بھی نہیں
پاک ہے گرد وطن سے سر داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
یہی مقصود فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہانگیری ،محبت کی فراوانی

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی ،نہ ایرانی ،نہ افغانی
ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا ،محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی ،وہ خراسانی ،یہ افغانی ،وہ تورانی
تو اے شرمندہ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودہ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا

اسلامی تصور قومیت کی افادیت سے آگاہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے ملت اسلامیہ کو حقائق کا حساس وادراک کرنے کی جانب متوجہ کیا ہے اور اپنے موقف کی مزید وضاحت کی ہے اور حق وصداقت پر مبنی اپنے خیالات کو اپنے افکار کی اساس بنایا ہے۔انھوں نے تاریخ اسلام اور پوری انسانیت کے مسائل کو ایک منفرد انداز میں اپنے افکار کی زینت بنایا ہے۔علامہ اقبال نے اسلامی قومیت کے حوالے سے تاریخ اور اس کے مسلسل عمل پر بھرپور توجہ دی ہے۔انھوں نے تاریخ کے ہر دور پر نظر رکھی ہے اور تاریخ کے وہ سربستہ راز اور سیل زماں کے وہ مہیب تھپیڑے جو کئی اقوام کو اپنی مہیب موجوں میں بہالے گئے ان کے اسرار ورموز کی گرہ کشائی کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا۔وہ اپنے تاریخی شعور کو اس طرح بروئے کار لاتے ہیں کہ اس کے معجز نما اثر سے اذہان کی تطہیر وتنویر کا اہتمام ہوتا چلا جاتا ہے۔یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ علامہ اقبال نے ہر قسم کی عصبیت ،منافرت ،عناد اور تنگ نظری کے خلاف سخت جدو جہد کی اور اخوت کی جہانگیری اور محبت کی فراوانی کو مقیاس العمل قرار دیا۔۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد برعظیم کے بے بس اور مظلوم مسلمانوں کو جس ہلاکت آفریں دور سے گزرنا پڑا اور جن لرزہ خیز ،اعصاب شکن اور روح فرسا واقعات کا سامنا کرنا پڑا وہ تاریخ کا بہت بڑا سانحہ ہے۔ان مسموم حالات میں جب مسلمانوں کی عدم شناخت اور بے چہرگی کا مسئلہ گمبھیر صورت اختیار کرتا چلا جا رہا تھا، علامہ اقبال نے اپنے افکار سے ملت اسلامیہ میں ایک نئی روح پھونک دی:

منفعت ایک ہے، اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی ، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک؟

یورپ میں نظام سیاست نے جو رخ اختیار کیا ہے اس میں مفاد پرستی، خودغرضی اور استحصال نے انسانیت پر عرصہ حیات تنگ کر دیا ہے۔ علامہ اقبال کی خواہش تھی کہ ملت اسلامیہ ایسا نظام سیاست وضع کرے جو کہ فطرت اور اسلام کے تقاضوں سے کامل ہم آہنگی رکھتا ہو۔ یہ نظام سیاست اسلام کے ابد آشنا اصولوں کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ اسلام کے نظام سیاست کو وہ ملت اسلامیہ کے لیے نجات کا وسیلہ سمجھتے تھے اور ملی وحدت کے لیے اسے بہت اہمیت دیتے تھے۔ انھوں نے ملت اسلامیہ میں آزادی کی تڑپ پیدا کرنے کے لیے تاریخ کے مسلسل عمل کی جانب توجہ مبذول کرائی۔ ہیگل نے لکھا ہے:

> چونکہ انسانی آزادی اور احساس آزادی ایک چیز ہے لہٰذا آزادی کا ارتقا شعور و ذہن کا ارتقا ہے۔ اس عمل میں ہر قسم کے افکار تشکیل پاتے ہیں اس لیے فلسفہ تاریخ صرف انسانی عمل ہی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ وہ کائناتی عمل سے بھی پردہ اٹھاتا ہے۔[۱]

علامہ اقبال نے ملت اسلامیہ کو درپیش خطرات کا نہایت خلوص اور دردمندی سے جائزہ لیا۔ انھوں نے اس جانب توجہ دلائی کہ آزمائش اور ابتلا کا یہ دور محض اتفاقی یا حادثاتی ہرگز نہیں بلکہ اس کے پس پردہ صدیوں کی غفلت اور بے بصری ہے جس کے مسموم اثرات کے باعث اجتماعی زندگی اور گلشن ہستی میں رتیں بے ثمر اور کلیاں شرر کر دی گئی ہیں۔ اجتماعی زندگی میں فلاح اور امن و سلامتی کا دور لانے کے لیے ضروری ہے کہ ملت کے اندر ایک جذب باہمی کو پروان چڑھایا جائے۔ انسانی جبلت کا تقاضا یہی ہے کہ باہمی اشتراک عمل سے زندگی کی شب تاریک کو سحر کیا جائے۔ علامہ اقبال نے واضح کر دیا کہ جذب باہمی ہی سے اس عالم آب و گل کے سارے نظام چل رہے ہیں۔ جن پر باطن ایام روشن ہے وہ جانتے ہیں کہ کہکشاں کے ستارے ہمیں یہی درس دیتے ہیں کہ باہمی اشتراک عمل ہی سے ضیاپاشیاں ممکن ہیں۔ ملت اسلامیہ کے بارے میں علامہ اقبال نے یہ واضح کر دیا کہ مذہب کو روحانی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے سے نئی قدریں اور نئے انداز فکر سامنے آسکتے ہیں۔ اپنے ایک خطبے میں وہ لکھتے ہیں:

> میں تو کچھ یوں ہی دیکھ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ شاید ہم مسلمانوں کو بتدریج سمجھا رہی ہے کہ اسلام نہ تو وطنیت ہے، نہ شہنشاہیت ہے، بلکہ ایک انجمن اقوام جس نے ہمارے خود پیدا کردہ حدود اور نسلی امتیازات کو تسلیم کیا ہے تو محض سہولت تعارف کے لیے۔ اس لیے نہیں کہ اس کے ارکان اپنا اجتماعی مطمح نظر محدود کر لیں۔[۲]

انسانی زندگی کی تمام تر رنگینیاں اور ہنگامہ آرائیاں فکر انسانی کی جولانیوں، بصیرت افروز تصورات اور فہم و ادراک کی مرہون منت ہیں۔ انسان کی تخلیق سے فطرت کے متعدد مقاصد وابستہ ہیں۔ انسانی ذہن و ذکاوت کے اثمار سے نہ صرف موجودہ بلکہ آنے والی نسلیں بھی فیض یاب ہوتی ہیں۔ عقل و خرد کی گتھیاں

سلجھانے والے اس بات سے متفق ہیں کہ فہم وادراک نے روشنی کا جو سفر شروع کیا ہے اس کی تکمیل نسل در نسل فکر انسانی کے پیہم سفر اور تاریخ کے مسلسل عمل سے وابستہ ہے۔عصری آ گہی سے متمتع افکار اقبال میں ان تمام امور کی جانب توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔زندگی کی برق رفتاریوں اور سائنسی انقلاب نے حالات کا رخ بدل دیا ہے۔علامہ اقبال نے بدلتے ہوئے سماجی حالات اور تغیر پذیر اقدار و روایات کے بارے میں اپنے مضمون ''قومی زندگی'' میں لکھا ہے:

> اب دماغوں، تہذیبوں اور تمدنوں کی ہنگامہ آرائیوں کا وقت ہے اور یہ جنگ ایک ایسی جنگ ہے جس کے زخم رسیدہ زنگاری اور کافوری مرہم سے ہرگز اچھے نہیں ہو سکتے۔ظاہری فاصلہ جو قوموں کے خلا و ملا میں بہ منزلہ ایک سد سکندری کے تھا، اب ریل اور پیام برقی کی حیرت انگیز ایجادوں سے گویا بالکل معدوم ہو گیا ہے۔[۳]

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے اس دور میں علامہ اقبال نے اس جانب متوجہ کیا ہے کہ فغان صبح گاہی کو ترک نہ کیا جائے۔اگر ہلاکت خیزیوں کے اس دور میں کہیں اماں ملنے کی توقع ہے تو وہ اللہ ھو ہی ہے جس کے زیر سایہ رہنے سے سیل زماں کے تھپیڑوں سے بچنے کی ایک معتبر صورت موجود ہے۔یورپ میں نظام سیاست، معیشت، معاشرت اور تہذیب نے جو رخ اختیار کیا علامہ اقبال اس سے مطمئن نہ تھے۔ انھوں نے ملت اسلامیہ کے لیے ایسا نظام وضع کرنے کی ضرورت پر زور دیا جو کہ فطرت اور اسلام کے تقاضوں سے کامل ہم آہنگی رکھتا ہو۔فکر اقبال کے تاریخ کے مختلف ادوار میں جو دور رس اثرات مرتب ہوئے ان کا ایک عالم معترف ہے۔ان افکار کی بدولت تہذیبی اور ثقافتی سطح پر ایک ہلچل پیدا ہوئی اور جمود کا خاتمہ ہوا۔تاریخ اسلام کے اوراق میں علامہ اقبال کی فہم وفراست، ذہن وذکاوت اور ذہنی وشعور فکری اثاثے کو نہایت خوش اسلوبی سے محفوظ کیا گیا ہے۔یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فکر اقبال نے جس تاریخی عمل کو مہمیز کیا اس کے اعجاز سے آنے والی نسلوں کے لیے چشم کشا صداقتیں محفوظ کر دی گئی ہیں۔اسلام کی ابد آشنا تعلیمات اور آفاقی طرز حیات کے بارے میں علامہ اقبال نے نہایت صراحت کے ساتھ لکھا ہے:

> اسلام کی حقیقت ہمارے لیے یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہے۔اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا جب تک کہ ہم اصول اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں۔بہ الفاظ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔[۴]

علامہ اقبال نے مذہب کی آفاقی تعلیمات کے بارے میں اپنے روحانی تجربات کا اظہار 1914ء کے بعد نہایت واضح انداز میں کیا۔اسرار خودی میں انھوں نے اپنے نئے تصورات پر کھل کر بات کی اور اپنے تصور خودی کے ذریعے نئے زمانے اور نئی سوچ کی نوید سنائی۔علامہ اقبال کا دل ملت اسلامیہ کی زبوں حالی

پر خون کے آنسو روتا تھا۔انھوں نے ملت اسلامیہ کو درپیش خطرات کے بارے میں اپنی تشویش کا برملا اظہار کیا۔انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ غلامی میں کوئی امید بر نہیں آتی اور نہ ہی اصلاح احوال کی کوئی صورت دکھائی دیتی ہے۔جب تک ذوق یقیں پیدا نہیں ہوتا غلامی کی زنجیریں نہیں کٹ سکتیں۔اپنی شاعری اور نثر میں علامہ اقبال نے اسلامی نظام سیاست میں انسانیت کے اتحاد، وقار، سربلندی اور مساوات کو کلیدی اہمیت کا حامل قرار دیا۔ان کے نزدیک جمعیت اقوام کے بجائے جمعیت آدم کا تصور زیادہ مفید ہے۔مغرب میں تہذیب کی آڑ میں اخلاقی اقدار کو جس بے دردی سے نقصان پہنچایا جا رہا ہے، علامہ اقبال نے اس پر ہمیشہ اپنے دلی رنج کا اظہار کیا اور اس مذموم روش کے خلاف آواز بلند کی۔مغربی تہذیب کی یلغار اور استعمار کے جبر کے خلاف علامہ اقبال نے مثبت شعور و آگہی پروان چڑھانے کی کوشش کی:

مجھ کو تو سکھادی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی
علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
گرچہ ہے دلکشا بہت حسن فرنگ کی بہار
طائرک بلند بال دانہ و دام سے گزر
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
وہ آنکھ کہ ہے سرمہ افرنگ سے روشن
پرکار و سخن ساز ہے نم ناک نہیں ہے
یہ حوریان فرنگی دل و نظر کا حجاب
بہشت مغربیاں جلوہ ہائے پابہ رکاب
سوال مے نہ کروں ساقی فرنگ سے میں
کہ یہ طریقہ رندان پاک باز نہیں
خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف
جسے کساد سمجھتے ہیں تاجران فرنگ

وہ شے متاع ہنر کے سوا کچھ اور نہیں
اعجاز ہے کسی کا یا گردش زمانہ
ٹوٹا ہے ایشیا میں سحر فرنگیانہ

علامہ اقبال نے مغربی تہذیب کو بہت قریب سے دیکھا تھا اسی لیے وہ اس کے تاریک پہلوؤں کو منظر عام پر لانے میں کبھی تامل نہیں کرتے۔ ان کی شاعری میں مغربی تہذیب کے بارے میں جو انداز فکر پایا جاتا ہے، وہ بالعموم مخالفانہ نوعیت کا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب کی مخالفت علامہ اقبال کے رگ و پے میں رچی ہوئی تھی۔[۵] اسی جذبے کے زیر اثر وہ اپنے خیالات کے اظہار اور تزکیہ نفس کی کوئی نہ کوئی صورت تلاش کر لیتے ہیں۔ علامہ اقبال نے مغربی جمہوری نظام پر بھی کڑی تنقید کی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اہل مغرب نے جس جمہوری نظام کو اپنے ممالک میں نافذ کر رکھا ہے وہ بڑی حد تک ملوکیت کی راہ ہموار کر دیتا ہے۔ اس نام نہاد جمہوری نظام نے آمریت کے رجحانات کو تقویت دی ہے۔ جہاں تک سلطانی جمہور کا تعلق ہے تو وہ مغرب کے جمہوری نظام میں ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے۔ مغرب کی سیاسی تحریکوں نے جو گل کھلائے ہیں اس کے مسموم اثرات سے گلشن ہستی میں کلیاں شرر بن گئی ہیں اور آہیں بے اثر ہو کر رہ گئی ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے مغربی طرز جمہوریت کے بارے میں علامہ اقبال کے خیالات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> علامہ اقبال مغربی جمہوریت کے اس طریق کار کے مخالف تھے جس کی وجہ سے قوم کے صالح اور عاقل افراد مجالس آئین ساز میں داخل نہیں ہو سکتے۔ بعض مشرقی ممالک نے مغربی طریق انتخاب اعضاے مجلس کا ڈھانچہ تقلیداً اختیار کر لیا ہے یا ان کے گذشتہ فرنگی حکمران مصلحتاً اس کو رائج کر گئے ہیں، اس میں یہ عجیب و غریب نتیجہ نکلتا ہے کہ علم و فضل والے اہل الرائے لوگ منتخب نہیں ہو سکتے۔ ووٹ ایسے جاہل زمینداروں کو ملتے ہیں جو اپنا نام تک نہیں لکھ سکتے۔[۶]

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید
فرنگ آئین جمہوری نہاد است
رسن از گردن دیوے کشاد است
چو رہزن کاروانے در تگ و تاز
شکم با بہر نانے در تگ و تاز
گروہے را گروہے در کمین است

خدایش یا ر اگر کارش چنین است
زمن دہ اہل مغرب را پیامے
کہ جمہور است تیغ بے نیامے
چہ شمشیرے کہ جاں ہا می ستاند
تمیز مسلم و کافر نداند

مغرب کی سیاسی تحریکوں کے زیر اثر وہاں وطنیت کا تصور جڑ پکڑ گیا ہے۔فکر اقبال کے ارتقائی مراحل پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں انھوں نے وطنیت پر بھی اپنے موافق خیالات کا اظہار کیا۔ان کی نظمیں ''ہمالہ''، ''تصویر درد''، ''ترانہ ہندی''، ''ہندوستانی بچوں کا گیت'' اور ''نیا شوالہ'' میں وطنیت کے بارے میں ایک سازگار فضا موجود ہے۔جلد ہی علامہ اقبال نے اپنے ابتدائی دور کی اس شاعری سے آگے نکل کر ملت کے تصور کو اپنا مطمح نظر بنا لیا۔مغرب میں وطنیت کا جو تصور صدیوں سے پروان چڑھ رہا ہے علامہ اقبال نے اس پر گرفت کی اور اقتضائے وقت کے مطابق ملت اسلامیہ کے لیے قومیت کا ایک آفاقی تصور پیش کر کے ملی اتحاد کی راہ ہموار کر دی۔مغربی سیاسی تحریکوں نے اپنے مذموم مقاصد کے لیے ملت اسلامیہ کو انتشار کی بھینٹ چڑھانے کی سازش کی۔اہل مغرب اسلامی وحدت سے خائف تھے اس لیے انھوں نے ملت اسلامیہ کے اتحاد کی راہ میں ہمیشہ روڑے اٹکائے۔علامہ اقبال نے دین اور وطن میں موجود حد فصل کی جانب توجہ دلائی اور یہ واضح کر دیا کہ جہاں تک ایک سیاسی تصور کا تعلق ہے دین اور وطن میں بعد المشرقین ہے اور ان کا یک جا ہونا ممکن نہیں۔اہل مغرب نے دین اور وطن کو یک جا کرنے کی آڑ میں لا دینیت پر مبنی خیالات کی ترویج و اشاعت پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔علامہ اقبال نے مغربی سیاسی تحریکوں پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے ان کے مسموم اثرات سے متنبہ کیا۔انھوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی بھی مخالفت کی۔ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف علامہ اقبال نے کھل کر لکھا۔اپنی مشہور نظم ''خضر راہ'' میں انھوں نے سرمایہ دارانہ استحصالی نظام کے خلاف نہایت خلوص اور دردمندی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔انھیں اس بات کا رنج ہے کہ سرمایہ دار ہمیشہ مکر کی چالوں سے وسائل پر غاصبانہ طور پر قابض ہو جاتا ہے اور مزدور اپنی سادگی کے باعث مات کھا جاتا ہے۔اشتراکیت نے تاریخ کے مادی جدلیاتی تصور کو حرز جاں بنایا اور مذاہب کے تصور کو طاق نسیاں کی زینت بنا دیا۔علامہ اقبال کی شاعری میں مارکس کی اجتماعیت سے کہیں زیادہ بلند پروازی موجود ہے جو قاری کو ایک جہان تازہ سے آشنا کرتی ہے۔سرمایہ دارانہ نظام سے علامہ اقبال کو شدید نفرت تھی لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ یہ سوچ اشتراکیت کے زیر اثر تھی بہت بڑی غلطی ہے۔علامہ

اقبال نے ہمیشہ توحید، رسالت اور قرآن حکیم کی آفاقی تعلیمات کو اپنے افکار اور اسلوب کی اساس بنایا۔ انقلاب روس کے بعد علامہ اقبال نے یہ محسوس کر لیا کہ مغربی تہذیب اور مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادیں لرز رہی ہیں۔مغرب کی سیاسی تحریکوں نے ہر شعبہء زندگی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔مغربی استعمار نے نو آبادیات میں غلامانہ نوعیت کا نظام تعلیم نافذ کیا۔اس نظام تعلیم کا مقصد محض حصول معاش قرار دیا گیا۔مغرب کی بھونڈی نقالی نے محکوم اقوام کو پوری دنیا میں تماشا بنا دیا۔کردار سازی پر توجہ نہ دی گئی اور محکوم ممالک میں عوام کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔معاشرتی زندگی سے خلوص اور دردمندی کا عنصر ناپید ہو گیا۔اہل مغرب نے اسلامی معاشرے کو ہوس زر، خودغرضی اور بے سکونی کی بھینٹ چڑھا دیا۔المیہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرے میں مغرب کی چیرہ دستیوں کے باعث اخلاقی اقدار و روایات کو شدید ضعف پہنچا۔ عورت کو جذبہ امومت سے عاری کرنے میں مغربی سیاسی تحریکوں کا گہرا عمل دخل ہے۔

علامہ اقبال نے مذہب کی آفاقی تعلیمات کی روشنی میں انسانیت کے وقار اور سربلندی کو اپنا نصب العین بنایا۔مغربی استعمار نے محکوم ممالک میں فسطائی جبر سے انسانیت کی توہین، تذلیل اور بے توقیری کو وتیرہ بنا لیا۔ان اعصاب شکن حالات کے باعث زندگی کا تمام منظر نامہ ہی گہنا گیا۔علامہ اقبال نے زندگی کی برق رفتاریوں کو محسوس کرتے ہوئے آلام روزگار کی تمازت اور اس کی شدت کو اپنے افکار کی گرفت میں لیا اور اسے الفاظ کے قالب میں ڈھالا۔انھوں نے پرخلوص جذبات سے اقدار کی روح کشید کی۔ان کی بصیرت نے انھیں زندگی کی اقدار عالیہ تک رسائی کی راہ بتائی اور وہ اس راہ پر گامزن ہو کر اپنے من میں غوطہ زن ہو کر سراغ زندگی پانے پر آمادہ کرتے رہے۔انھوں نے خودی کو تیغ فساں کے مانند سمجھا اور اس کے زیر اثر اپنی دنیا آپ پیدا کرنے پر اصرار کیا۔ یہ بات اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ جب تک افراد اپنی عزت نفس اور خودی کی نگہبانی کر کے ان کے بتائے ہوئے لائحہ عمل کو نہیں اپناتے وہ کبھی معزز و مفتخر نہیں ہو سکتے۔اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک نہ کہنے والے جبر کے سامنے سپر انداز ہو کر بیرونی قوتوں کے حلقہ بگوش ہو جاتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اسی لیے خودی کی حفاظت کو اہم قرار دیا۔علامہ اقبال نے مذہب کی آفاقی اقدار کو اسلامی معاشرے کے دوام کے لیے ناگزیر قرار دیا۔انھیں یقین تھا کہ مذہب کی قوت کو روبہ عمل لا کر ابتلا اور آزمائش کی گھڑیوں سے بچ نکلنے میں کامیابی ہو سکتی ہے۔اگر اسلامی معاشرے میں تہذیبی، ثقافتی، اخلاقی، انسانی اور ملی اقدار کے تحفظ اور بالیدگی پر توجہ دی جائے تو آج بھی آگ انداز گلستاں پیدا کر سکتی ہے۔علامہ اقبال نے اپنے عہد کی سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے جملہ نشیب و فراز جس خلوص کے ساتھ پیش کیے ہیں وہ قابل توجہ ہیں۔اپنے عہد کے بارے میں ان کا شعور اور انداز فکر دراصل تاریخ اسلام کے وسیع مطالعہ

کی اساس پر استوار ہے۔انھوں نے ملت اسلامیہ کے مستقبل کے بارے میں جو پیش بینی کی ہے اس کا تعلق ان کے حال سے ہے۔انھوں نے اپنے عہد کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو تجزیہ کیا وہ چشم کشا صداقتوں سے لبریز ہے۔ان کے تخلیقی عمل میں ان کے عہد کی روح جس طرح رچ بس گئی ہے ہر دور میں فکر ونظر کو مہمیز دیتی رہے گی۔

❁.....❁.....❁

حوالہ جات وحواشی

۱۔ ڈاکٹر مبارک علی، تاریخ اور فلسفہ تاریخ، فکشن ہاؤس، لاہور، اشاعت اول، ۱۹۹۳ء، ص ۱۴۰۔

۲۔ علامہ محمد اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، اردو ترجمہ سید نذیر نیازی، بزم اقبال، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۳۴۔

۳۔ علامہ محمد اقبال، مقالات اقبال، مرتبہ سید عبدالواحد معینی، القمر انٹر پرائزز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۷۵۔

۴۔ علامہ محمد اقبال، ملت بیضا پر ایك عمرانی نظر، مترجم ظفر علی خان، بزم اقبال، لاہور، نومبر ۱۹۹۴ء، ص ۱۸۔

۵۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، بزم اقبال، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۷۔

۶۔ ایضاً، ص ۲۲۶۔

❁.....❁.....❁